POSTED AT NDPSO ON 10-11 AUGUST 2004
U (C) 160/2003-05 TO POST WITHOUT PREPAYMENT
POSTAL REGN. NO. DL-11186/2003-05 R.N.I NO. 2186/57

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

۱۵ تا ۲۱ / اگست ۲۰۰۴ء (15-21 AUGUST 2004)

شمارہ نمبر: ۳۱ جلد نمبر: ۶۳ Price: Rs. 2/=

اسلام اور مسلمانوں سے متعلق یورپ کے کذب و افترا اور ان کی تاریخی غلطیوں کا ازالہ علامہ شبلی کی زندگی کا خاص مقصد اور مشن تھا، ان کی اکثر تصانیف اور مضامین و مقالات مورخین یورپ کی کسی نہ کسی افترا پردازی ہی کے رد و ابطال اور احقاق حق کے لیے معرض وجود میں آئیں، علامہ شبلی کی تصنیف 'اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

۱۹۰۶ء میں علامہ شبلی نے اپنے شاگرد مولانا محمد علی جوہر کے اصرار پر بڑودہ کا سفر کیا اور انھی کے یہاں قیام پذیر ہوئے، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مولانا جوہر نے ان سے اورنگ زیب پر عائد الزامات کے جواب و تردید میں ایک مفصل مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ چناں چہ سفر سے واپسی کے بعد علامہ شبلی نے ماہنامہ

"اس کی فرد قرارداد جرم اتنی لمبی ہے کہ شاید کسی مجرم کی نہ ہوگی، باپ کو قید کیا، بھائیوں کو قتل کرایا، دکن کی اسلامی ریاستیں مٹا دیں، ہندوؤں کو ستایا، بت خانے ڈھا دیے، مرہٹوں کو چھیڑ کر تیموری سلطنت کے ارکان متزلزل کر دیے۔"[۲]

ان الزامات اور عالم گیر کے مفروضہ مظالم کی تشہیر اس قدر زور و شور سے کی گئی کہ وہ 'افسانہ بزم و انجمن' بن گئے، علامہ شبلی نے بحیثیت مورخ ان الزامات کا جواب دینا اپنا فرض سمجھا، چناں چہ انھوں نے عہد و سطیٰ کی معتبر تاریخوں اور تاریخ نویسی کے اصول کی بنیاد پر مورخین یورپ کی افترا پردازیوں اور ان کی غلط کاریوں کا پردہ فاش کر کے ان کو حقیقت و صداقت کا آئینہ دکھایا اور فرمایا:

پہلی قسط

"اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر"

ایک جائزہ

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی (ادب کدہ، مہراج پور، انور گنج، اعظم گڑھ - ۲۷۶۰۰۱ [یوپی])

'الندوہ' لکھنؤ میں جس کے وہ ایڈیٹر تھے، عالم گیر پر سلسلۂ مضامین شروع کیا، جو دسمبر ۱۹۰۶ء سے مارچ ۱۹۰۸ء کے درمیان شائع ہوا، یہ سلسلۂ مضامین اتنا مقبول ہوا کہ ۱۹۰۹ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کرنا پڑا اور اب تک اس کے دسیوں اڈیشن طبع ہو چکے ہیں اور بعض دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے، ڈاکٹر سید محمود نے اس کا انگریزی میں ترجمہ یا خلاصہ لندن سے شائع کیا۔[۱] دارالمصنفین کے سابق ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے انگریزی میں ترجمہ کیا جسے عالم گیر کے نام سے ادارۂ ادبیات دلی نے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا۔

ہندوستان میں انگریز مورخوں نے اپنے مخصوص سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت تعصب و عناد میں سرشار ہو کر مسلمان حکمرانوں پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے، ان کی تنقید و تنقیص کا سب سے زیادہ نشانہ مظلوم اورنگ زیب کی ذات رہی، جس کو مطعون و مجروح کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا، علامہ شبلی کے الفاظ میں:

تعصب نے لٹنے کے سارے داستان میں یاد ہے اتنا کہ اورنگ زیب ہندو کش تھا ظالم تھا ستم گر تھا

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا علامہ شبلی نے اپنے مذہبی جذبات، دینی حمیت و غیرت اور اورنگ زیب کے اسلامی عقائد و خیالات سے متاثر ہو کر اس پر لگائے گئے الزامات کو بے معنی اور بے سروپا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے یا واقعی عالم گیر پر عائد الزامات درست نہ تھے۔ سید شریف الحسن نقوی لکھتے ہیں:

"انھوں نے محض اورنگ زیب کے اسلامی عقائد سے متاثر ہو کر اس کی طرف داری نہیں کی ہے بلکہ تاریخ کا تنقیدی مطالعہ کر کے ہی وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اورنگ زیب پر لگائے ہوئے الزامات بے بنیاد ہیں۔"[۳]

علامہ شبلی نے یہ سوال قائم کیا ہے کہ جو الزامات عالم گیر پر لگائے جاتے ہیں وہ بعض دوسرے بادشاہوں پر بھی لگائے جا سکتے ہیں مگر انھی کے الفاظ میں "اس کی کیا وجہ ہے کہ شاہ جہاں کے الزامات کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں اور عالم گیر کے وہی الزامات افسانہ بزم و انجمن ہیں"۔ یہ الزام جواب کی تفصیل سے انھوں نے محض اس لیے گریز کیا ہے کہ اس سے قومی تفریق کو تحریک ہوتی ہے اور شاہجہاں پر اگر الزام ثابت بھی ہو جائے تو عالم گیر اس سے بری نہیں ہو سکتا۔[۴]

یہاں کتاب کے مندرجات پر ایک نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ براہ راست معلوم ہو جائے کہ انگریز مورخوں نے عالم گیر کی شخصیت کو بدنام کرنے اور اپنے مطلب برآری کے لیے تاریخ میں کس طرح بددیانتی سے کام لیا ہے، ایک جگہ علامہ شبلی نے ان کے کذب و افترا اور جھوٹ میں جھوٹ ملانے کا ذکر کیا ہے، اس سے مورخین یورپ کے تعصب کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور علمی بددیانتی کا بھی، وہ لکھتے ہیں:

"یورپین مورخوں کے اعتراضات اگرچہ نہایت پادر ہوا ہوتے ہیں اور اس لیے ان کا جواب دینا نہایت آسان بات ہے لیکن بایں ہمہ جواب دینے والا سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے، یورپین مورخین ایک اعتراض کو بیان کرنے میں جو خود غلط ہوتا ہے، پے در پے اور بہت سے جھوٹ ملاتے جاتے ہیں، جواب دینے والا ایک جھوٹ کا جواب دینا چاہتا ہے تو سامنے ایک اور جھوٹ نظر آتا ہے اور ادھر متوجہ ہوتا ہے تو ایک اور جھوٹ نمایاں ہوتا ہے، مسلسل دروغ بیانی اور افتراؤں کے ہجوم پر بے اختیار اس کو طیش آ جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اصل واقعہ کے انکشاف پر متوجہ ہو غصہ سے بے قابو ہو جاتا ہے، خود مجھ پر بھی اثر پڑا لیکن میں ان حریفوں کو یہ موقع نہ دوں گا کہ وہ میرے طیش سے فائدہ اٹھائیں۔"[۵]

دکن کی اسلامی ریاستوں کو برباد کرنے کا الزام

عالم گیر پر انگریز مورخوں کے الزامات کی فہرست میں ایک جرم یہ ہے کہ اس نے دکن کی اسلامی ریاستیں حیدرآباد اور بیجاپور کو برباد کر دیا، حیدرآباد چوں کہ ایک شیعہ ریاست تھی اس لیے

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ انجمن کے قائم مقام صدر

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) کے سینئر نائب صدر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے انجمن کے قائم مقام صدر کی حیثیت سے اپنے عہدے کا چارج لے لیا ہے۔

گوڑ صاحب تقریباً ۳۰ سال سے انجمن سے مختلف حیثیتوں میں وابستہ ہیں وہ انجمن کے نائب صدر بھی رہے ہیں۔

ڈاکٹر گوڑ اردو تحریک کے نہایت سرگرم اور فعال کارکن اور علم بردار ہیں اس کے علاوہ ان کا شمار اردو کے ممتاز ترقی پسند ادیبوں میں بھی ہوتا ہے۔ (ادارہ)

اس کی بربادی میں عالم گیر کا مذہبی تعصب کارفرما تھا۔ ان ریاستوں کی بربادی سے مرہٹوں کا زور قائم ہوا اس لیے یہ عالم گیر کا سیاسی جرم بھی تھا۔[۵]

علامہ شبلی نے سب سے پہلے اسی الزام کا جائزہ لیا ہے اور معتبر تاریخی شہادت اور اصول تاریخ سے ثابت کیا ہے کہ چوں کہ حیدرآباد کا حاکم ابوالحسن شاہ (تانا شاہ) نہایت عیش پرست اور ظالم تھا، وہ مرہٹوں سے ساز باز کر کے انھیں مدد دیتا رہا تا کہ وہ سلطنت مغلیہ کو برباد کر دیں۔ اس نے خود اپنی ریاست میں مرہٹوں کو اس قدر بڑھا دیا کہ وہ علانیہ مسلمانوں پر ظلم کرتے اور مسجدوں کی بے حرمتی کرنے لگے، اس لیے مجبوراً عالم گیر کو اس کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ حیدرآباد میں مرہٹوں کا اس قدر زور قائم ہو گیا تھا کہ حیدرآباد کا استیصال کسی اسلامی سلطنت کا نہیں بلکہ ایک مرہٹی سلطنت کا استیصال تھا۔[۶]

بیجاپور کے حکمرانوں کا بھی یہی رویہ رہا، وہ بھی مرہٹوں کے معین و مددگار رہے، اس لیے ان پر بھی عالم گیر نے فوج کشی کی اور سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ عالم گیر کے اس الزام کا جائزہ لینے کے بعد علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"ہمارے دوستوں کو یہ معلوم نہیں کہ دکن کی یہ اسلامی ریاستیں مرہٹوں کی پناہ گزیں بن گئی تھیں اور اگر عالم گیر حیدرآباد اور بیجاپور کو فتح نہ کرتا تو آج بڑودہ اور گوالیار کی طرح حیدرآباد اور بیجاپور پر بھی مرہٹوں کا علم لہراتا ہوتا۔"[۷]

دکن میں پانچ ریاستیں گول کنڈہ،

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

تیسری اور آخری قسط

میرا ذہنی سفر

شمس الرحمن فاروقی (سی-۲۹، ہیسٹنگس روڈ، الہ آباد-۲۱۱۰۰۱)

"مایا کاسکی تم اپنی پتلون بار بار اوپر کیوں کھینچتے ہو؟" ایک لڑکی کچھ ہسٹیریائی انداز میں بول پڑتی ہے۔

"تو کیا تم چاہتی ہو کہ یہ نیچے گر پڑے؟" مایا کاسکی نظم پڑھتے ہی پڑھتے جواب دیتا ہے۔

مضمون میں مایا کاسکی کو تقریباً سوویت کلچر ہیرو (Soviet Culture Hero) بنا کر پیش کیا گیا تھا، لیکن اس کی خودکشی کا، انقلاب روس کی حقیقت سے اس کی بے اطمینانی، مایوسی اور فریب شکستگی کا کہیں ذکر نہ تھا۔ کچھ ایسا ہی انداز 'ترقی پسند ادب کے معمار' نامی سلسلۂ کتب کا تھا۔ مجاز یا منٹو شاعر اور افسانہ نگار نہیں بلکہ افسانوی دنیا کے شہزادے معلوم ہوتے تھے۔ ذاتی زندگی اور کردار کتنا ہی رومانی اور دلکش کیوں نہ ہو، اس سے ادب کی خوبی کہاں ظاہر ہوتی تھی؟ اور میں تو بہت بچپن ہی میں یہ سبق سیکھ چکا تھا کہ ظاہر اور باطن ایک نہیں ہوتے۔ زندگی کے بارے میں ترقی پسندوں کا نظریہ بہت یک رخا اور بچکانہ حد تک سادہ معلوم ہوتا تھا۔ میں گیا ہوں میں رہا ہوں کہ جب ہم لوگوں نے گورکی اور اس کے ناول 'ماں' (Mother) کا بہت غلغلہ سنا۔ میں بھی کہیں سے مانگ کر وہ کتاب لے آیا۔ ان دنوں میری انگریزی پڑھنے کی رفتار بہت سست تھی، لیکن میں نے کئی دن میں وہ ناول پڑھ ہی ڈالا اور اسے ختم کر کے میں نے سوچا کہ پھر ہوا کیا؟ ناول میں کچھ برے لوگ تھے، کچھ اچھے لوگ تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ بھی ہندوؤں کی طرح کی ذاتیں ہیں کہ دولت مند اور اقتدار والے لوگ برے ہیں اور برے ہی رہیں گے اور مزدور اور محنت کش لوگ اچھے ہیں اور وہ اچھے ہی رہیں گے۔ میرا دل ان لوگوں سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ سارے کا سارا گورکی ایسا نہیں۔ کچھ مدت بعد مجھے اس کا شاہکار افسانہ 'چھبیس مرد اور ایک عورت' (Twenty-six Men and a Girl) پڑھنے کا موقع ملا تھا تو وہ بھی محنت کش لوگوں کے بارے میں، مگر وہاں انسانی فطرت اور جبلت کی پیچیدگیاں تھیں، صورت حال اول سے آخر تک غیر متعین اور کئی معنویتوں کی حامل تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ مجھ سے زیادہ عمر یا تجربے والے کسی ترقی پسند دوست نے مجھے وہ افسانہ پڑھنے کا مشورہ دیا ہو۔ 'تم نے Mother پڑھی کہ نہیں؟' یہ تو سب پوچھتے تھے۔

ان دنوں ذہین مسلمان نوجوانوں یا نوعمروں کے سامنے دانشوری کی ایک اور راہ تھی۔ جماعت اسلامی اس وقت اشتراکیت اور جدلیاتی مادیت کے مقابلے میں ایسے اسلام کا تصور پیش کر رہی تھی جو کمیونزم کی ہی طرح ساری دنیا میں انقلاب اور سماجی تغیر لانے کا دعوے دار تھا لیکن جس کا راستہ اور طریق عمل کمیونسٹوں سے بالکل الگ اور مختلف تھے۔ میری طرح بہت سے نوعمر مسلمان لڑکے جنھیں ترقی پسندی سے لگاؤ نہ تھا، یا جو ترقی پسندی سے اکتا چکے تھے، لامحالہ جماعت اسلامی کی طرف جھکے۔ ہم لوگوں کے لیے نجات اللہ صدیقی کی شخصیت نمونہ کار تھی۔ نجات اللہ صدیقی اس وقت اسلامیہ کالج چھوڑ کر رامپور مدرسۂ جماعت اسلامی میں عربی اور اسلامیات پڑھنے چلے گئے تھے۔ لیکن ان کا نام ہر طرف تھا کہ انھوں نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ دونوں میں سارے صوبے میں اچھی پوزیشن حاصل کی تھی۔ وہ ہم لوگوں کے کچھ عزیز بھی ہوتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کساد بازاری اور مسلمانوں کے لیے تنگی اور سختی کے زمانے میں وہ اپنی مرضی سے دنیا چھوڑ کر دین حاصل کرنے کے لیے گئے تھے اور اس میں ان کے گھر والوں کی مرضی نہ شامل تھی۔ میرے اسلامیہ کالج کے ساتھیوں میں اقبال احمد انصاری (بعد کے اقبال اے انصاری، انگریزی کے پروفیسر اور حقوق انسانی و حقوق اقلیت کے لیے نبرد آزما دانشور) اور ابرار حسین خاں (بعد کے ڈاکٹر ابرار اعظمی) جماعت اسلامی کی طرف جھکے۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی کے ہم خیال بہت سے لکھنے والے جگہ جگہ موجود تھے۔ یہ لوگ عمومی طور پر خود کو 'تعمیر پسند' اور اپنی انجمن کو 'انجمن تعمیر پسند مصنفین' کہتے تھے۔ میں نے ترقی پسند حلقے میں اٹھنا بیٹھنا ترک کر کے تعمیر پسند حلقے میں آنا جانا شروع کر دیا۔ جماعت اسلامی کا ادبی رسالہ اس وقت کوئی نہ تھا، لیکن اس کے اسلامی یا تبلیغی رسالوں میں ادب بکثرت شائع ہوتا تھا۔ اسی زمانے (۱۹۵۰ء) میں یا اس سے کچھ پہلے میں نے 'گلستاں' بند کر دیا تھا، شاعری بھی تقریباً چھوڑ دی تھی اور افسانے یا کبھی کبھی تنقید لکھنے لگ گیا تھا۔ سرور صاحب نے جذبی صاحب کے مجموعے 'فروزاں' پر جو دیباچہ لکھا تھا اس کا تنقیدی اسلوب مجھے بہت مرغوب طبع آیا تھا۔ نئے زمانے کے شاعروں میں جذبی، ساحر، حفیظ جالندھری اور فیض کا بہت سارا کلام مجھے زبانی یاد بھی تھا۔ سرور صاحب کی طرز پر میں نے بھی جذبی صاحب پر 'میرا پسندیدہ شاعر' کے نام سے مضمون لکھا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ میں نے سرور صاحب کی ہی باتیں دہرا دی ہیں۔

بہر حال، یہ بات مجھ پر بہت جلد صاف ہو گئی تھی کہ 'تعمیر پسند' ادب میں تعمیر کے علاوہ بہت سارا انکار بھی تھا۔ اقبال تو خیر چل سکتے تھے، محسن کاکوروی جیسوں کی نعت بھی شاید ٹھیک تھی، بہت نرمی کی گئی تو حمید صدیقی لکھنوی کی نعت بھی قبول کی گئی، لیکن ترقی پسند ادب تقریباً سارے کا سارا نا قبول تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ میر اور غالب اور سودا اور ذوق وغیرہ اور خاص کر مثنویاں اور ہجویں اور قصیدے، کم و بیش بالکل برادری باہر تھے۔ خیر، اس وقت میں یہ خیال کرتا تھا کہ جلدی کیا ہے، یہ معاملے طے ہو جائیں گے۔ فی الحال تو 'اچھا' اور 'صالح' ادب لکھنا میرا مقصود ہے۔ لہٰذا میں نے ۱۹۵۰-۵۱ء میں اپنی پہلی طویل تحریر لکھی اور اسے ناولٹ قرار دیا۔ ان دنوں میرٹھ سے ایک رسالہ نیا نیا نکلا تھا 'معیار'۔ یہ ہم لوگوں کا رسالہ تھا کہ اس میں بھی 'تعمیر پسند' ادب لکھتے تھے۔ ایک صاحب جن کا نام شاید نجم الاسلام تھا، وہ اس کے مدیر تھے۔ حفیظ میرٹھی (جن کے کلام کے ہم سب پہلے ہی سے مداح تھے) بھی کسی حیثیت میں اس سے منسلک تھے۔ میرا 'ناولٹ' (جسے شاید طویل افسانہ کہنا موزوں تر تھا) اسی 'معیار' کی کئی اشاعتوں میں بالاقساط چھپا۔ اس کا نام 'دلدل سے باہر' تھا اور اس کا پلاٹ بھی کچھ دلدلی قسم کا تھا۔ میرے پاس اس کا مسودہ یا مطبوعہ کچھ بھی نہیں۔ آج جب یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ پوری تحریر میں دنیا، اخلاق، ہندوستانی دیہات، متوسط الحال مسلم معاشرہ، ان سب چیزوں کے بارے میں سادہ لوح مفروضات ہی مفروضات تھے۔

جماعت اسلامی سے میری بہت دن نہ بنی۔ پہلی مایوسی تو اس دن ہوئی جب جماعت نے کمیونسٹ پارٹی کے طرز پر ادب اور ادیبوں کو منظم کرنا چاہا اور ایک نئی انجمن قائم کی گئی اور اس کا نام 'ادارۂ ادب اسلامی' رکھا گیا (اور شاید اب بھی یہی نام ہے)۔ مجھے سخت کوفت ہوئی کہ لفظ 'ادارہ' میں تو دفتر اور نوکر شاہی اور گشتی مراسلوں اور رجسٹروں کی مہک تھی، یعنی اس میں ہر اس چیز کے وجود کی تنبیہ تھی جس سے مجھے نفرت تھی اور جس نے مجھے ترقی پسندی سے برگشتہ خاطر کیا تھا۔ لیکن میں نے کہا ابھی روز اول ہے، کچھ دن اور دیکھتے ہیں۔ دوسری مشکل یہ آئی کہ میں نے انٹرمیڈیٹ پاس کر کے بی اے میں نام لکھایا ہی تھا کہ ہارڈی کے ناولوں نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہارڈی کے نام سے تو میں مجنوں صاحب کے مختصر ناولوں (یا ہندوستانی رنگ اور اردو زبان میں ہارڈی کے بعض ناولوں کی تلخیص) کے ذریعے آشنا ہو چکا تھا۔ لیکن انگریزی میں پڑھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ انگریزی میں اس کا ایک ہی ناول میں نے پڑھا تھا کہ مجھ پر یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ

ہارڈی کے ناولوں کی تکنیک، محرومی، دنیا میں انصاف اور نیکی کے فقدان کا احساس، انسانی زندگی کے المیاتی ابعاد، یہ سب باتیں 'ادارۂ ادب اسلامی' کے ایوانوں میں زیب نہ دیں گی اور ہارڈی تھا کہ مجھے اپنی دنیا میں کھینچے لیے جا رہا تھا۔ اسی زمانے میں مجھے فرائڈ کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب، برٹرنڈ رسل کی History of Western Philosophy، اے سی وارڈ (A. C. Ward) کی کتاب Twentieth Cintury Literature اور جدید انگریزی شاعری کے کئی انتخابات کالج لائبریری میں مل گئے۔ میں نے ان کتابوں کو پڑھ ڈالا۔ فرائڈ اور رسل پوری طرح سمجھ میں آئے یا نہیں، اس کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا، لیکن پڑھا میں نے انھیں خوب جی لگا کر۔ بہت سے انگریزی اور انگریزی کے توسط سے فرانسیسی اور روسی ناولوں کو میں انٹرمیڈیٹ میں اور بی اے کے پہلے سال میں پڑھ چکا تھا۔ بی اے کا دوسرا سال تھا کہ لائبریری کی نئی کتابوں میں مجھے آندرے ژید (Andre Gide) کا ناول The Coiners دکھائی دے گیا۔ عسکری صاحب کی تحریروں کے طفیل میں اس کے نام سے واقف تو تھا ہی، میں نے وہ ناول جلد از جلد پڑھ ڈالا۔ اس میں مجھے ایک نئی ہوشمندی اور دنیا کے بارے میں ایک چالاکی اور ٹھنڈی سوچ کا احساس ہوا جس کے مقابل ہارڈی کی شدت فکر اور کائناتی درد آلودگی ذرا سادہ مزاج لگتی تھی۔ لیکن میں ہارڈی ہی کا پرستار رہا اور دھیرے دھیرے کر کے میں نے اس کے وہ سب ناول پڑھ ڈالے جو کالج کی لائبریری میں دستیاب تھے۔

تو ایسی صورت حال میں 'ادارۂ ادب اسلامی' سے میری ذہنی اور روحانی دوری میں تیزی آنا لازمی تھا۔ ادارے کی تنگ نظری، ادب کے بارے میں سطحی خیالات اور مصنوعی، بے ضرر تحریروں پر بھی 'اصلاحی' اور 'تبلیغی' عناصر کو مرجح ٹھہرانے اور زندگی کے بارے میں نہایت خط مستقیم کا سا رویہ رکھنے کے سبب یہ دوری آہستہ آہستہ مکمل مغائرت میں بدلنے لگی۔ بھلا ایسا ادبی نظریہ کس کام کا جو ادب کے مطالعے سے لطف کا عنصر منہا کر دے اور ادب کی سب سے بڑی خصوصیت سے انکار کر دے کہ اس کے ذریعے انسان کو اپنے وجود کی آگاہی، دوسروں کے وجود کا شعور اور کائنات میں اپنے وجود اور مقام کے بارے میں علم حاصل ہوتا ہے۔ جب میں نے بی اے سال دوم کا امتحان دے کر گرمی کی چھٹیوں میں شیکسپیئر کو پڑھا تو میرا یہ احساس اور شدید ہوا کہ ادب کے بارے میں ہمارے ترقی پسند رہنما اور ادارۂ ادب اسلامی کے بزرگ دونوں ہی کے تصورات ناقص ہیں اور ناقص ہی نہیں، وہ اچھے ادب کو سمجھنے کے لیے ناکافی ہیں اور عمومی طور پر اچھے ادب کی تخلیق میں حارج بھی ہیں۔ مختصر یہ کہ میں ادب کی کوئی ایسی تعریف، یا ادیب کے لیے کوئی ایسا لائحۂ عمل قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا جو مجھے غالب، ہارڈی اور شیکسپیئر سے محروم کر دے۔

محمد حسن عسکری نے کسی جگہ پر شیکسپیئر کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ڈرامے A Winter's Tale کے چوتھے باب سے یہ مصرعے نقل کیے ہیں:

Deffodils
That com before the
swallow dares, and take
The winds of March with
beauty.

موقع یہ ہے کہ ڈرامے کی ہیروئن پرڈیٹا (Perdita) ایک مدت تک جلاوطنی میں تھی، چند لوگوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے اور پھولوں، گجروں اور پھول کے زیوروں کے تذکرے میں وہ پھولوں کے نام اور ان کی صفات بتانے لگتی ہے۔ ڈیفوڈل کا پھول بہار کا اولین پھول ہوتا ہے، اس لیے وہ کہتی ہے کہ ڈیفوڈل تو اس وقت آ جاتے ہیں جب جنوب میں سردیاں گزار کر واپس آنے والی ابابیلیں بھی آنے کی ہمت نہیں کرتیں۔ ڈیفوڈل لوٹ آتے ہیں اور مارچ کی ہواؤں کو اپنے حسن سے زیر نگیں کر لیتے ہیں۔ عسکری صاحب نے شیکسپیئر کے لفظوں dares اور take کی غیر معمولی بلاغت کی بات کی ہے۔ پھولوں کے چلے جانے اور پھر واپس آنے کے مضمون پر میں نے مدتوں بعد صیدی طہرانی کا ایک شعر پڑھا تو پتا چلا کہ تہذیبوں کا اختلاف ایک ہی تجربے کو بیان کرنے میں کیسی کیسی طرفہ کاریاں پیدا کرتا ہے۔ صیدی طہرانی:

دلیلِ فراغت خوباں ہمیں بس عشق بازاں را
کہ گل یک سالہ راہ از بہرِ بلبل باز می گردد

(معشوقوں کے بھی دل میں چاہے جانے کی تمنا اور چاہنے والے کی پاس خاطری ہوتی ہے۔ عاشقوں کے لیے اس کا ثبوت یہ کافی ہے کہ پھول چلے جاتے ہیں اور ایک سال کی مسافت طے کر کے بلبل کی خاطر پھر واپس آ جاتے ہیں)۔

صیدی کا شعر ذاتی اور داخلی عالم کی بات کرتا ہے اور شیکسپیئر کے مصرعے کائناتی اور خارجی عالم کی بات کرتے ہیں۔ حقیقت ایک ہی ہے لیکن دونوں کے یہاں اس کے معنی الگ الگ ہیں اور لطف یا حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں ہی معنی آفاقی طور پر سچے اور درست، لیکن 'حقیقت نگاری' یا 'واقعیت' کے معیار سے ساقط ہیں۔ صیدی طہرانی کا شعر بھلے ہی میں نے شیکسپیئر کے مصرعے پڑھنے کے برسہا برس بعد پڑھا ہو، لیکن ادب کے طالب علم کی حیثیت سے میری تمنا یہی تھی کہ ادب کے سہارے انسان کے تمام تجربات کے تمام رنگوں کو دیکھنے، تمام خوشبوؤں کو سونگھنے، تمام سیاہیوں اور پستیوں کو جھیلنے اور تمام بلندیوں اور پاکیزگیوں کی متبرک فضاؤں میں اڑنے پھرنے کے لائق ہو سکوں۔ میرے لڑکپن میں ادب کے جن نظریات کا بول بالا تھا وہ صیدی کے شعر یا شیکسپیئر کے مصرعوں کو کمل سے باہر تو نہ کر دیتے، لیکن ان کی مملکت میں ایسی شاعری وجود میں نہ آ سکتی تھی اور نہ ہی اس کی کچھ قدر بھی ممکن تھی اگر ہم اسے کہیں باہر سے لے بھی آتے۔ ان کے یہاں تو 'واقعیت' (Realism) اور 'حقیقت' (Facts) کی تلاش ہے اور صیدی اور شیکسپیئر کے یہاں حقائق (Truths) ہیں جو اعداد و شمار کی کتابوں میں نہیں ملتے۔

بی اے کا امتحان (۱۹۵۳ء) دے کر میں نے خوب دل لگا کر شیکسپیئر اور غالب کو پڑھا۔ کنگ لیئر (King Lear) میں ایڈگر (Edger) کی یہ بات (باب پنجم، منظر دوم، مصرع ۹ تا ۱۱) میرے دل میں کیل کی طرح چبھی، لیکن بالآخر گلاب بن کر کھلی اور ٹھنڈک بن کر میری روح کے مساموں میں سما گئی:

Men must endure
Their going hence, even as
their coming hither,
Ripeness is all

دنیا سے جانے اور دنیا میں رہنے، دونوں کی کیفیتوں کو جاننے کے لیے غالب نے میری رہنمائی کی:

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

لیکن اوتھیلو (Othello) کو تو کسی بت عربدہ جو نے نہیں بلکہ اپنی ہی طبع ہلاکت پسند نے قعر مرگ میں ڈال دیا تھا (باب پنجم، منظر دوم، مصرع ۳۳۰ تا ۳۳۳):

I pray you, in your letters,
When you shall these
unlucky deeds relate,
Speak of me as I am,
nothing extenuate,
Nor set down aught in
malice, then you must
speak
Of one that loved not
wisely but too well;

غالب کے یہاں محبت اور زندگی ایک ہی شے ہیں، لیکن محبت کی لذت اسی وقت ہے جب اس کا حاصل موت ہو۔ ان کی دنیا میں فریادی یہ نہیں پکارتا کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے۔ وہ اس بات کی دہائی دیتا ہے کہ اس پر ظلم نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن وہی خنجر جس کے لیے غالب کی تمنا تھی کہ معشوق کے ہاتھ میں ہو اور عاشق کی گردن پر پھرے، اوتھیلو ہی کے ہاتھوں اس کے اپنے جگر میں اتر جاتا ہے۔ اوتھیلو اہل علم سے انصاف طلب تھا کہ میرے بارے میں بے کم و کاست لکھنا، کچھ معافی تلافی کی بات نہ کرنا۔ میں وہ ہوں جس نے ٹوٹ کر محبت تو کی، لیکن خود غرضی سے بھرپور کی۔ وہ اپنے بارے میں جانتا ہے کہ he loved not wisely اور یہ کہ عشق میں wisdom یعنی حکمت یہ ہے کہ انسان خود کو معشوق کے ہاتھوں میں مردہ تصور کرے۔ میں نے کئی سال بعد بلکہ ایک عمر بعد مولانا روم کی مثنوی پڑھی تو اس میں یہ شعر دیکھا:

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ
زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

اوتھیلو کی کم عقلی یہ نہ تھی کہ اس نے اپنی معشوق پر اعتماد نہ کیا۔ اس کی کم عقلی یہ تھی کہ اس نے خود کو معشوق سے الگ وجود فرض کیا اور یہی وجہ تھی کہ اوتھیلو اپنے خنجر سے مرا، معشوق کے خنجر سے نہیں۔

شیکسپیئر کی نظم Venus and Adonis میں نے پہلی بار ۲۱ جون ۱۹۵۳ء کو پڑھی۔ اس وقت میری عمر سترہ برس کچھ مہینے تھی۔ گیارہ بارہ سو مصرعوں کی اس نظم پر میں نے جگہ جگہ حاشیے لکھے ہیں، جو اب تقریباً پچاس برس بعد بچکانہ معلوم ہوتے ہیں۔ حسب ذیل دو بند نظم کے تقریباً آخر میں ہیں۔ ان کے درمیان میں میرا حاشیہ ہے: True, quite true۔ اب اس فقرے کو دیکھ کر میں کچھ بے دلی سے مسکراتا ہوں لیکن ان مصرعوں کا ترجمہ کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ وینس (Venus) اپنے عاشق اڈونس (Adonis) کے ماتم میں روتے ہوئے کہتی ہے:

عشق وہاں شک میں مبتلا ہوگا جہاں
خوف کا کوئی محل نہ ہو
اور جہاں معاملہ اعتماد کے بالکل لائق نہ
ہو وہاں وہ بے خوف رہے گا
وہ رحم بھی ہوگا اور حد سے زیادہ ظالم بھی
اور جہاں وہ بے انتہا منصف محسوس ہوگا
وہاں سب سے زیادہ فریبی ہوگا
جہاں وہ سب سے زیادہ سیدھا لگے گا
وہاں سب سے زیادہ بے راہرو ہوگا
وہ خوف دے گا شجاعت کو، ہمت دے گا
بزدلوں کو
وہ جنگوں کا اور حادثات ہلاکت خیز کا
سبب بنے گا
وہ باپ بیٹے کے درمیان مناقشہ پیدا
کرے گا
وہ ہر بے اطمینانی اور آزردگی کا غلام ہوگا
جیسے سوکھی سوختنی آگ کی غلام ہوتی ہے
چوں کہ عشق نے میرے دلبر کو عین عالم
جوانی میں ہلاک کیا ہے
اس لیے جو بہترین عاشق ہوں گے وہ
اپنی محبت کا پھل نہ کھا سکیں۔

میں نے آخری حاشیے میں لکھا تھا کہ نظم پڑھ لینے کے بہت دیر بعد تک بھی اس کی نغمگی دماغ میں گونجتی رہے گی۔ افسوس کہ میرا ترجمہ اس قدر سپاٹ ہے کہ مجھے خود شرم آ رہی ہے لیکن شاید آج کی زبان میں اس نظم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے تو رومی کی زبان اور [illegible] کا قلم چاہیے۔ یہاں Venns and Adonis کا ذکر کرنے اور ان مصرعوں کا روکھا سوکھا ترجمہ پیش کرنے اور ان پر اپنے لکھے ہوئے حاشیے کو نقل کرنے سے مقصود صرف یہ ہے کہ آپ کو اپنی اس وقت کی ذہنی اور روحانی کیفیت سے آگاہ کر سکوں، ورنہ اس نظم کی باریکیاں اس وقت کی کچی عمر میں تو کیا آج بھی پوری طرح سمجھنے کا دعویٰ میں نہیں کر سکتا۔

(بشکریہ 'آج' کراچی، شمارہ نمبر ۳۹، جنوری–مارچ ۲۰۰۳ء)

☆☆☆

اردو دُنیا

دہلی کے اسکولوں میں اردو کی حالت زار

اسمبلی میں رام ویر سنگھ بدھوڑی نے حکومت کو توجہ دلائی

نئی دہلی (۲۷رجولائی)۔ آج دہلی اسمبلی میں اپوزیشن کانگریس کے قائد جناب رام ویر سنگھ بدھوڑی نے اردو کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ دہلی میں اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں کی کارکردگی بہت خراب ہوچکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اسکولوں میں ہائی اسکول امتحان میں کامیابی کا اوسط محض ۲۸ فیصد رہا۔ انٹر میں اردو اسکولوں کا نتیجہ بھی محض ۲۹ فیصد تھا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ذریعۂ تعلیم کے لڑکیوں کے ایک اسکول میں ۲۲ طالبات میں سے صرف دو طالبات ہی کامیاب ہوسکی ہیں۔ ان اسکولوں کی خراب کارکردگی پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے جناب بدھوڑی نے مزید کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ اردو اسکولوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جاتا جیسا کہ دوسری زبانوں کے ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں کے ساتھ ہے۔ انھوں نے اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی قلت پر بھی حکومت کی توجہ مبذول کرائی۔ انھوں نے حکومت سے درخواست کی کہ اردو اسکولوں کے طلبہ کو تعلیمی مواد اور درسی کتابیں وغیرہ فراہم کی جائیں۔ (قومی آواز۔ نئی دہلی)

اردو اکادمی، دہلی کی سڑکوں کے نام اردو میں جہاں غلط لکھے ہیں انھیں درست کرائے گی

نئی دہلی (۳؍اگست)۔ دہلی سرکار نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دلی کی سڑکوں کے نام اردو میں جہاں جہاں غلط لکھے ہوئے ہیں انھیں اردو اکادمی دہلی کی نگرانی میں درست کرایا جائے۔ اردو اکادمی کی ایک پریس ریلیز کے مطابق یہ سلسلہ کل صبح دس بجے جانکی پوری کے ماپل مارگ، سیوا کیندر کو کنٹریکشن سے شروع ہوگا۔ اس موقع پر اردو اکادمی اور این ڈی ایم سی کے ذمہ داران کے ساتھ اکادمی کے وائس چیئرمین جناب مرہ افضل موجود ہوں گے۔ ریلیز میں بتایا گیا ہے کہ اکادمی کی نگرانی میں دلی کی دیگر سڑکوں کے نام بھی بہت جلد درست کرائے جائیں گے اور خوش خط میں لکھوایا جائے گا۔
(اخبار مشرق۔ دہلی)

اردو اخبارات کے اشتہارات کی پالیسی پر

یوپی حکومت کو سپریم کورٹ کا نوٹس

اترپردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی درخواست پر سماعت ۱۳؍اگست کو

الٰہ آباد (۱۰؍اگست)۔ اترپردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے سپریم کورٹ کے جسٹس ایس این ورئیا اور جسٹس اے کے ماتھر کی دو رکنی بنچ کی جانب سے اترپردیش حکومت کو نوٹس جاری کیے جانے کا خیرمقدم کیا جس میں سپریم کورٹ نے یوپی حکومت سے پوچھا ہے کہ اس نے اردو اخبارات کے لیے اشتہاری بجٹ کا صرف دس فیصد ہی مقرر کیوں کیا ہے جب کہ اردو کو اترپردیش کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جاچکا ہے اس کے علاوہ ان تمام پٹیشنوں کو سرکاری وکیل کی درخواست پر دو ہفتے بعد لسٹ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس پر سپریم کورٹ نے اگلی سماعت کے لیے ۱۳ اگست مقرر کی ہے۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے بانی و کنوینر جناب بحرالعلوم اور قومی صدر جناب محمد اختر چونڈی والا نے اپنی ایک مشترکہ پریس ریلیز میں اترپردیش کے ذریعے نکالے گئے سپریم کورٹ کے آرڈر کی کاپی میڈیا کو مہیا کرائی۔ تنظیم کی اسپیشل لیو پٹیشن نمبر 21600/03 پر سپریم کورٹ نے اترپردیش حکومت کو نوٹس جاری کرکے جواب طلب کیا ہے کہ اس نے اشتہار پالیسی تفریق و امتیاز پر مبنی کیوں بنائی ہے۔ اس مقدمے میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ اردو کو سرکاری زبان ہونے کی بنا پر ہندی کے مساوی اشتہاری بجٹ دیا جائے تاکہ سرکاری زبان اردو قانون کے مطابق اہم اشتہاروں کو پوری ریاست کی اردو داں عوام کے حق میں ریاست کے تمام اردو اخباروں میں مشتہر کرایا جاسکے۔ دونوں عہدے داروں نے کہا کہ ۳۰ رجولائی ۲۰۰۴ کو تنظیم کے چار مقدمے سپریم کورٹ کے سامنے سماعت کے لیے لسٹ پر تھے مگر یوپی اسمبلی کے اسپیکر کے وکیل نے اپنا جوابی حلف نامہ داخل کرنے کے لیے دو ہفتے کا وقت عدالت سے مانگ لیا جسے سپریم کورٹ نے قبول کرتے ہوئے تمام مقدموں کو دو ہفتے بعد لسٹ کرنے کا حکم دیا اور سپریم کورٹ کے دفتر نے ان چاروں مقدموں پر اگلی سماعت کے لیے ۱۳ راگست ۲۰۰۴ء کی تاریخ مقرر کی ہے۔ ان مقدموں میں تنظیم کی طرف سے اس کے جنرل سکریٹری (لیگل) ڈاکٹر لال بہادر نے بذات خود بحث کی۔
(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اوما بھارتی کی اردو دشمنی کا کھُلا ثبوت

بھوپال (۲۲رجولائی)۔ کانگریس کے ممبر اسمبلی جناب عارف عقیل نے ریاستی حکومت پر الزام لگایا کہ اس نے اقلیتوں کی فلاح کے محکمے کی زیر نگرانی چلنے والے اداروں کے حساب کتاب اردو کے بجائے ہندی اور انگریزی میں تیار کرنے کا حکم جاری کیا ہے۔

عارف عقیل صاحب نے اسمبلی میں وقفۂ سوالات کے دوران یہ معاملہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ یہ قدم اردو کی مخالفت میں اٹھایا گیا ہے جو گزشتہ پانچ دہائیوں کی روایت کے خلاف ہے۔ عارف عقیل صاحب حکومت کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے کہ حساب کتاب اردو میں رہنے کی وجہ سے آڈٹ میں مشکلیں پیش آتی ہیں کیوں کہ آڈٹ کرنے والے افراد اردو نہیں جانتے ہیں۔
(اخبار مشرق۔ دہلی)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی وفات پر

تعزیتی پیغامات اور قراردادیں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی وفات پر سوگواران آزاد کی جانب سے انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کو بے شمار تعزیتی پیغامات اور قراردادیں موصول ہورہی ہیں۔ ہم ان پیغامات اور قراردادوں کو بھیجنے والوں کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں 'ہماری زبان' کے پروفیسر جگن ناتھ آزاد نمبر میں شائع کی جائیں گی۔
(ادارہ)

انجمن ترقی اردو ویشالی کی ماہانہ نشست

حاجی پور (ڈاک سے)۔ انجمن ترقی اردو ویشالی کی ماہانہ نشست بہ مقام ساجدہ منزل حاجی پور، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں انجمن ترقی اردو ویشالی کے دیرینہ رفیق ماسٹر ارشاد احمد خاں کی سعودی عرب میں اچانک رحلت پر ارکان انجمن نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مرحوم کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس طرح اردو کے ادیبوں، شاعروں میں عرفان صدیقی، ساغر اعظمی، توقیر کاظمی، محمد احسان صدیقی اور قمر سیمابی کے انتقال پُرملال پر ارکان انجمن نے اپنے افسوس کا اظہار کیا اور جملہ مرحومین کے لیے مغفرت کی دعائیں کی گئیں۔
(پریس ریلیز انجمن ترقی اردو ویشالی)

پروفیسر م۔ ن۔ سعید

شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد میں

وزیٹنگ پروفیسر مقرر

حیدرآباد (۵رجولائی)۔ پروفیسر محمد انوارالدین صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کی اطلاع کے مطابق پروفیسر م۔ ن۔ سعید (سابق صدر شعبۂ اردو بنگلور یونیورسٹی) کو شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد میں وزیٹنگ پروفیسر مقرر کیا گیا ہے۔

اردو لیکچروں کی تقرری پر

اسکول سروس کمیشن کی وضاحت

کلکتہ (۲۳رجولائی)۔ ۱۹۹۸ء میں مغربی بنگال اسکول سروس کمیشن کے اشتہار کو دیکھ کر مشتری علاقے سے کچھ طلبہ نے اردو لیکچروں کی خالی اسامیوں کے لیے درخواست دی تھی۔ اطلاع کے مطابق منتخب ہونے کے باوجود ان طلبہ کو تقرری کا خط نہیں ملا ہے۔ ہائی کورٹ کے حکم کے مطابق مغربی بنگال اقلیتی کمیشن نے مغربی بنگال اسکول سروس کمیشن کو موجودہ حالات کی تفصیل جانکاری کے لیے خط بھیجا تھا۔ اسکول سروس کمیشن نے ۱۶رجون ۲۰۰۴ کو اس کی اطلاع دی کہ ابھی لیکچروں کے لیے کوئی بھی جگہ خالی نہیں ہے اور یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ جیسے ہی ممکن ہوگا ان لیکچروں کا تقرر کردیا جائے گا۔
(اخبار مشرق۔ کلکتہ)

اترپردیش میں اردو فارسی مدرسہ بورڈ کی تشکیل

لکھنؤ (۲۷رجولائی)۔ اترپردیش سرکار نے ریاست کے مدارس میں تعلیمی معیار بلند کرنے کے لیے اردو فارسی مدرسہ بورڈ کی تشکیل کی ہے۔

یہ اعلان یہاں سرکاری طور پر کیا گیا ہے۔ ریاستی پارلیمانی امور اور شہری ترقیات کے وزیر جناب محمد اعظم خاں نے آج یہاں نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے یہ اطلاع دی۔ انھوں نے بتایا کہ اس بورڈ کا چیئرمین مولانا خالد اشرف کو بنایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس ضمن میں جلد ہی ایک بل بھی لایا جائے گا۔

جناب اعظم خاں نے یہ بھی بتایا کہ سرکار نے اقلیتی کمیشن بھی بنا دیا ہے اور شیخ سلمان اس کے چیئرمین ہوں گے۔ انھوں نے بتایا کہ کمیشن کی مدت تین سال ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں پہلی بار کمیشن کو بااختیار بنایا گیا ہے کمیشن افسران کو طلب کرسکتا ہے اور قصوروار پائے جانے پر سزا بھی دے سکتا ہے۔
(قومی آواز۔ نئی دہلی)

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

'ھماری زبان' کا اداریہ

مکرمی! 'ہماری زبان' ۲۲ تا ۲۸ر جولائی ۲۰۰۳ء کا شمارہ ملا۔ آپ نے اردو کے سلسلے میں نہایت بے باکی کے ساتھ فکر انگیز اداریہ قلم بند کیا ہے۔ جس کے ہر ہر لفظ سے سچائی جھانکتی ہوئی اور آزاد ہندوستان میں اپنی مظلومی کی داستان سناتی ہوئی ملی۔ دوران مطالعہ آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ ہمارے تنگ نظر اور خود پرست گروہ حضرات اپنے فائدے کے لیے ملک کو نقصان پہنچانے میں بھی خوف زدہ نہیں ہوتے۔

ہر ملک کے سچے محب وطن جانتے ہیں کہ وطن کی ہر چیز، وطن سے محبت کرنے والوں کو پیاری ہوتی ہے، وطن کی ساری زبانوں کی وہ قدر کرتے ہیں، وطن کی ہر تہذیب پر وہ نازاں رہتے ہیں، اپنے ہم وطنوں سے محبت کرتے ہیں، تمام مذاہب کا احترام کرتے ہیں، وطن کے ہر حصے کو وہ ترقی کی راہ پر دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ دنیا تنگ دل نہ کہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

لیکن تنگ دل اور خود غرض حضرات اہل وطن کے ذہن و دماغ کو اپنے گندے خیالات سے بگاڑنے کی کوشش کرتے رہے جس کے نتیجے میں گزشتہ پچاس برسوں سے ملک میں اپنے وحشی انگیز کے خوفناک اور ہولناک مناظر پیش کیے گئے ہیں جن سے اہل دل لرز اٹھے ہیں جس کے نتیجے میں میری زبان سے بار بار نکلا رہا ہے:

یہ ذرا دکھانے کا کیا سکن
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

تنگ نظری کی انتہا یہاں تک پہنچی کہ وہ زبان جو پیار و محبت کے نغمے سناتی رہی ہے اور یہ آواز بلند کرتی رہی ہے:

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

جس زبان نے تعصب کی لعنت سے ملک کو نجات دلانے کی مسلسل کوشش کی اور اہل وطن کو زور زور طریقے سے آواز دی:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں

جس زبان نے انگریزوں کی غلامی کے خلاف بڑھ چڑھ کر صرف نعرے لگائے بلکہ ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مظالم سے باخبر کیا اور ان میں وطن کو آزاد کرانے کے لیے جوش و خروش پیدا کیا تاکہ وہ جنگ آزادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں وہ زبان آزاد ہندوستان میں مظلوم بن کر رہ گئی ہے اور انگریزی زبان جو حکمراں تھی آج محبوب بن گئی ہے۔

آپ کے اداریے کو پڑھ کر بہت متاثر رہا اس دوران استاد رئیس رعنا کے یہ اشعار یاد آئے:

ہم کو بتائیں آج حقیقت میں صاف صاف
واضح کریں وہ ہم پہ جو ہے وجہ اختلاف
ارباب حل و عقد کریں اس کا انکشاف
اردو زباں سے کیوں ہوا اس وجہ انحراف
ہر انجمن سے دور مجالس سے دور کی
ایسا ہوا قصور، ہماری سے دور کی

کل تک یہی وطن کی سیاست کے ساتھ تھی
ہر معرکے میں اپنی جسارت کے ساتھ تھی
دانشوروں کی فکر و فراست کے ساتھ تھی
یہ سب کے ساتھ ساتھ صداقت کے ساتھ تھی
کام آئی یہ خطاب میں ہر ہم خطیب کے
ہاتھ کے شاعران وطن کے ادیب کے

کل تک یہی وطن میں عزیز وطن رہی
گویا چمن میں بن کے ہزار چمن رہی
نغمہ سرا رہی تو کبھی نعرہ زن رہی
میدان کارزار میں لشکر شکن رہی
نعرے سے دل ہلا دیے اہل فرنگ کے
اس لشکری نے آگے بچائے وہ جنگ کے

اس کے باوجود اردو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے اور ساتھ ساتھ اہل وطن سے محبت کا نغمہ الاپتے اور وطن کی عظمت کا گیت گاتے ہوئے وطن دوستی اور خدمت اہل وطن کا پیغام دے رہی ہے۔

اب یہ اہل وطن پر منحصر ہے کہ وہ اس پیاری اور محب وطن زبان کو کس حال میں رکھتے ہیں۔

(عبدالقوی دسنوی۔ بھوپال)

اردو میڈیم جونیر کالج کی متوازی جماعتوں کا قیام

جڑچرلہ (۱۴ر جولائی)۔ گرلز جونیر کالج جڑچرلہ میں اردو کی متوازی جماعتوں کے قیام میں عوامی نمائندوں کی عدم دلچسپی سے اردو داں عوام بالخصوص اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ انتخابات سے قبل ٹی آر ایس امیدوار ڈاکٹر سی لکشما ریڈی نے اردو کی متوازی جماعتوں کے قیام کا وعدہ کیا تھا لیکن تعلیمی سال کے آغاز کے باوجود اس سمت خاص پیش رفت نہ ہونے سے اردو داں عوام بالخصوص طلبہ میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں جب ہمارے نامہ نگار نے رکن اسمبلی ڈاکٹر سی لکشما ریڈی سے فون پر ربط پیدا کیا تو انھوں نے کہا ' چار دن میں اردو جماعتوں کا آغاز ہوگا اس لیے اردو میڈیم طالبات کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ میں نے اردو میڈیم کی متوازی جماعتوں کا جس طرح وعدہ کیا تھا اس کی تکمیل بھی جلد ہی ذمہ داری ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

ڈاکٹر کامل قریشی کی دسویں برسی کے موقع پر

قومی یکجہتی اور تعلیمی بیداری مہم سال کے طور پر منانے کا قریش نگر پبلک ویلفیر سوسائٹی کا فیصلہ

ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے قریش نگر پبلک ویلفیر سوسائٹی، دہلی نے ان کی دسویں برسی کو قومی یک جہتی کے فروغ اور تعلیمی بیداری مہم سال کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں ان کی حیات و خدمات پر سیمینار، مشاعرہ، تقاریب، تقسیم انعامات، تعلیمی ترقی کے لیے تحریری و تقریری مقابلے، اسکولوں میں طلبہ و طالبات کے داخلے، کھیل کود مقابلے، غریب اور ذہین طلبہ کے لیے وظائف، تعلیم نسواں، بے سہارا لڑکیوں کی شادی، آپسی بھائی چارہ اور قومی یک جہتی کے لیے متفرق ثقافتی پروگرام کا انعقاد اور فری میڈیکل کیمپ وغیرہ ملک کے مختلف صوبوں بالخصوص دہلی میں منعقد کیے جائیں گے۔

یہ تقریبات ڈاکٹر کامل قریشی کی یوم وفات ۱۵ر جون ۲۰۰۳ء سے شروع ہوکر پورے سال ملک بھر میں جاری رہیں گی۔

محبان وطن اور پرستاران ڈاکٹر کامل قریشی سے گزارش ہے کہ وہ ان تقریبات کے انعقاد میں قریش نگر پبلک ویلفیر سوسائٹی کے ساتھ دامے، درمے اور سخنے تعاون فرمائیں اور ایک عظیم محب وطن اور قوم پرست انسان کی خدمات اور کارناموں کو خراج عقیدت پیش کریں۔ اس موقع پر ڈاکٹر کامل قریشی کی غزلوں کا آڈیو کیسٹ اور ایک یادگاری مجلہ بھی جاری کیا جائے گا۔ جملہ منتظمین، ارباب بہاری اور عوام سے درخواست ہے کہ ان تقاریب میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں تشریف لائیں۔

محمد صادقین قریشی
جنرل سکریٹری قریش نگر پبلک ویلفیر سوسائٹی
فون 23543910, 9871419341

عبدالسلیم کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری

گلبرگہ۔ جناب عبدالسلیم کو ان کے تحقیقی مقالے "اردن جوشی کی فکشن نگاری کا جائزہ ان کے فنی موضوعات احساس محرومی و تنہائی کے تناظر میں" پر ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ جناب عبدالسلیم نے اپنا مقالہ ڈاکٹر حمید خاں (پرنسپل مرسید ڈگری کالج، اورنگ آباد) کی نگرانی میں مکمل کیا۔ ڈاکٹر عبدالسلیم انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے بھی گہرا شغف رکھتے ہیں۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

میرٹھ۔ محترمہ افشاں ملک کو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ نے ان کے تحقیقی مقالے "مہر عالم تاجی بحیثیت شاعر و افسانہ نگار 'ایک تجزیاتی مطالعہ'" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ انھوں نے اپنا یہ مقالہ میرٹھ کالج کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر خالد حسین خاں کی زیر نگرانی مکمل کیا ہے۔

کیرلا میں سہ روزہ

قومی اردو سیمینار کا انعقاد

کیرلا کے ضلع کنور کے مشہور تجارتی شہر تلیچری میں UGC اور NCPUL کے اشتراک سے برنن کالج کے شعبۂ اردو اور اس کے سابق طلبہ کی ایک ایسوسی ایشن (BULBUL) کی جانب سے ۲۶ تا ۲۸ر جنوری ۲۰۰۳ء کو قومی سطح پر VISUAL MEDIA AND URDU اور 'ریاست کیرلا میں اردو زبان کے فروغ و ارتقا' کے موضوع پر ایک سیمینار MSS آڈیٹوریم میں منعقد کیا گیا۔ اس کا افتتاح کالی کٹ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر Dr. A. N. P. UMMERKUTTY نے کی۔ اس کی صدارت گورنمنٹ برنن کالج کے پروفیسر پی ابوبکر اور نظامت پروفیسر اے۔ پی۔ زبیر نے کی۔ جناب محمد صاحب (صدر شعبۂ اردو برنن کالج) نے مہمانان خصوصی کا تعارف پیش کیا۔

سیمینار میں ملک کی دیگر ریاستوں سے بالخصوص آندھرا پردیش اور تامل ناڈو کے شرکا اور ماہرین تعلیم نے حصہ لیا۔ مدارس یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین نے ٹی وی سیریلس اور اشتہارات میں اردو زبان کے استعمال کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر مظفر شہمیری (صدر شعبۂ اردو ایس وی یونیورسٹی، تروپتی) نے 'کیرلا میں اردو کا مستقبل: چند تجاویز' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے 'کمپیوٹر اور اردو' کے موضوع پر اپنا مقالہ اور ویڈیو پروگرام پیش کیا۔

'کیرلا میں اردو' پر یہاں کے مقامی ماہرین تعلیم نے اپنی مادری زبان ملیالم میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اردو کو سیکولر زبان اور ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کی علامت قرار دیا۔ پروفیسر غوث محی الدین (سابق صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ برنن کالج) نے کیرلا میں اردو کی صورت حال کا ایک عمومی جائزہ لیا۔ جناب محی الدین کٹی (اردو ریسرچ آفیسر ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی، ترویندرم) نے کیرلا میں اردو غزل کی مقبولیت کے

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

ڈی ڈی نیوز چینل پر اردو کے لیے دو گھنٹہ وقت مقرر کرنے کا مطالبہ

پٹنہ (۲۶ر جولائی)۔ پرسار بھارتی بورڈ نے دوردرشن پر ایک جدید چینل ڈی ڈی نیوز چینل کے نام سے شروع کیا ہے۔ جس پر ۲۴ گھنٹے خبریں ٹیلی کاسٹ کی جاتی ہیں۔ دوردرشن کے اس چینل پر ہندی اور انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی خبریں ٹیلی کاسٹ ہوتی ہیں لیکن اس چینل پر اردو جیسی اہم زبان کو صرف دس منٹ کا ہی وقت دیے جانے پر سخت تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اردو داں طبقہ بورڈ کے اس سوتیلے رویے سے ناخوش ہے۔ اردو پروگرام کو مزید توسیع دینے اور اردو اخبارات کے جائزے خبروں کے بعد پیش کیے جانے کا مطالبہ پرسار بھارتی بورڈ اور مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات سے کیا جا رہا ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : سراج الدین علی خاں آرزو: ایک مطالعہ
مرتب : شاہد ماہلی
ضخامت : ۲۵۵ صفحات
قیمت : ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتا : غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
تبصرہ نگار : جاوید رحمانی

خان آرزو، جنھیں سراج المحققین بھی کہا گیا ہے، کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ شاعر، فرہنگ نویس، تذکرہ نگار اور ماہر زبان تھے اسی کے ساتھ فارسی، عربی، اردو، ہندی اور سنسکرت کے جید عالم بھی اور اصلاح سخن کے ادارے کے بانی بھی جس کی تین سو سالہ مضبوط روایت ملتی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے خان آرزو پر ایک روزہ سیمینار منعقد کیا جس میں دس مقالے پڑھے گئے۔ اس کتاب کا پہلا مقالہ جناب رشید حسن خاں کا ہے جو 'فارسی میں مجہول آوازوں سے متعلق خان آرزو کی رائے' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے خان آرزو کے اس مسلک کا جائزہ ایرانی اور ہندوستانی (قدیم و جدید) قواعد نویس اور اساتذہ کے بیان کی روشنی میں لیا ہے۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر خلیق انجم کا 'غرائب اللغات اور نوادر الالفاظ: ایک جائزہ' ہے۔ اس مقالے میں کئی اہم باتیں ہیں مثلاً: (۱) غرائب اللغات کو اردو کی پہلی لغت اور میر عبدالواسع کو اردو کا پہلا لغت نگار ہونے کا شرف حاصل ہے (۲) آرزو نے 'غرائب اللغات' میں بڑی تعداد میں ایسے الفاظ کی نشان دہی کی ہے جو سنسکرت اور فارسی میں مشترک ہیں (۳) ۱۷۵۱ء [سال تصنیف نوادر الالفاظ] کے آس پاس شاہجہاں آباد دہلی میں بولی جانے والی کھڑی بولی کو خان آرزو نے اردو کا نام دیا۔ پروفیسر تنویر احمد علوی نے قصائد عرفی کی قلمی شرح کا تعارف پیش کیا ہے جو خان آرزو نے لکھی تھی۔

پروفیسر وارث کرمانی نے 'سراج الدین علی خاں آرزو بحیثیت شاعر و نقاد' کے عنوان سے ان کی شاعری اور تنقیدی شعور کا مختصر مگر جامع جائزہ لیا ہے ''ایک طرف ایرانی تعصبات کا اعتراف کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ 'خان آرزو نے شاید نوے قصیدی ایسی شاعری کی ہے جس میں سبک ہندی کے معائب تو موجود ہیں محاسن کا کہیں پتا نہیں چلتا'۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے 'فارسی میں ادبی تنقید کی روایت اور تنبیہ الغافلین' کی سرخی قائم کرکے حزیں اور آرزو کے مناقشے کا اچھا مطالعہ کیا ہے۔ حزیں اپنے ادبی مسلک میں انتہا پسند تھے چناں چہ ہندوستانی فارسی گو شعرا ان کی زد میں آئے لیکن یہ اعتراضات نری خود بینی کا نتیجہ نہ تھے اس پہلو سے پروفیسر قاسمی نے ان کا مطالعہ نہیں کیا لیکن آرزو کا احتجاج بھی بجا نہ تھا جیسا کہ قزلباش خاں امید نے لکھا بھی ہے کہ ''حزیں کی زبان دانی پر شبہ نہیں لیکن اس قدر یقین ہے کہ جو کچھ آرزو نے کہا ہوگا وہ بے معنی اور ہیچ نہ ہوگا''۔ ہاں، اس میں تھوڑی شدت ضرور تھی جس نے حزیں کو اس حد تک انحراف کی بھی اجازت نہیں دی جو ایک تخلیق کار کا حق ہے اور تقاضا کیا کہ

''اٹھارہویں صدی میں حزیں انھیں لسانی وسیلوں، لفظی و معنوی صنائع کی پابندی کریں جو فارسی کے قدیم شعرا نے طرح رکھیں''۔ پروفیسر قاسمی نے اس قبیل کے اعتراضات کو نشان زد کیا ہے جو اچھا کام ہے۔ ڈاکٹر ریحانہ خاتون نے 'علی حزیں اور خان آرزو کے ادبی معرکے' پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ خان آرزو پر باضابطہ کام کر چکی ہیں اور اس سلسلے میں انھیں ان کے والد پروفیسر نذیر احمد کی رہنمائی حاصل رہی ہے جس پر کوئی بھی بجا طور پر فخر کر سکتا ہے لہٰذا ان کے اس مقالے کے بارے میں کچھ کہنے کی گنجائش کہاں رہتی ہے؟ ہاں، یہ خصہ البتہ کھٹکتا ہے کہ ''آرزو کی نکتہ چینیاں اور اعتراضات کی وجہ سے حزیں کی وقعت ہندوستانیوں کی نظر میں نہایت درجہ کم ہو گئی، ان کی اس کوشش نے سوسائٹی کا رنگ بدل دیا اور یہ بات ثابت کر دکھائی کہ ہندوستانی کسی بھی صورت میں ایرانی اہل زبان سے کم نہیں ہیں''۔

قرائن تو کچھ اور بتاتے ہیں جس حزیں کو تک چند بہار، مرزا قتیل، امام بخش صہبائی اور آزاد جیسے ہندوستانی علما، جلوہ وکیل بیسر ہوں ان کے بارے میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانیوں میں ان کی وقعت نہایت درجہ کم ہو گئی؟ دوسری طرف غالب کے عہد تک آتے آتے ہندوستانی فارسی گو فارسی تو فارسی اردو تک میں سند ایرانی شعرا کے استعمال کی مانگتے اور تسلیم کرتے تھے۔ غالب فارسی شاعری میں ایرانی اساتذہ کے پیچھے سر جھکائے چلتے تھے۔ فارسی لغات کی صحت پر غالب کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ''نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں، ہندیوں کو کیوں کر مسلم الثبوت جانیں۔ گنگے کا بچہ بزرو سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اس کو خدا کہے'' (بنام تفتہ خطوط غالب، مرتبہ خلیق انجم، ص ۳۵۶)۔

اس کتاب کا ایک عبرتناک مضمون ڈاکٹر عراق رضا زیدی کا ہے جو بعنوان 'وطن پرست خان آرزو کی اصلاحیں' لکھا گیا ہے۔ جس سیمینار میں یہ پڑھا گیا اسی میں میں اپنے اعتراضات پیش کر چکا ہوں جن کا اعادہ تفصیل حاصل ہے۔ اس کے بعد دو مضامین اور ہیں ایک مجمع النفائس پر اور دوسری خان آرزو کی شاعری پر۔ ان دونوں میں کوئی خاص بات نہیں، تنقید کا تفہیم ایک حصہ ضرور ہے لیکن صرف تفہیم تنقید نہیں کہلاتی یہ تنقید کی اہم لیکن ابتدائی منزل ہے اور یہ دونوں مضامین اسی منزل میں دم توڑ دیتے ہیں۔ آخری مقالہ ڈاکٹر ریحانہ خاتون نے 'آرزو کے استاد معاصر و شاگرد' کے عنوان سے لکھا ہے اس سلسلے میں جن مشاہیر پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں سے اکثر کے حالات پردۂ خفا میں تھے۔ اس طرح یہ مقالہ ہماری معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ خان آرزو پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی یہ پیش کش بے حد اہم ہے خصوصاً کلاسیکی ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک خوب صورت تحفہ ثابت ہوگی۔

☆☆☆

نام کتاب : نگینۂ عروض (حصہ دوم)
مصنف : اکرام تھچوری
ضخامت : ۲۳۰ صفحات
قیمت : ۱۳۰ روپے
ملنے کا پتا : سلطان منزل، ۳۱ یوسف زئی فتح پور، یوپی

تبصرہ نگار : سعید اختر اعظمی

جذبات و احساسات کی شمولیت کی وجہ سے شاعری کو فنون لطیفہ میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ موزوں طبع اشعار کہنے کے سلسلے میں 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں الطاف حسین حالی نے قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ شعر کے دونوں مصرعے انفرادی طور پر دو تین یا چار حصوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ یہ حصے رکن کہلاتے ہیں جس میں فعولن کی تکرار اسی رکن کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ شعر کی اصطلاحی ساخت میں فعولن، مفاعیلن، فاعلاتن، متفاعلن اور مستفعلن میں موقع بہ موقع حروف گرتے رہتے ہیں جسے زحاف کا نام دیا گیا ہے۔ فاضل مصنف اکرام تھچوری نے زیر نظر کتاب 'نگینۂ عروض' کے اس دوسرے حصے میں مفرد زحاف، مرکب زحاف، بحر مفرد سالم، بحر مرکب، بحر مفرد مزاحف، مرکب مزاحف، بحر متقارب سالم، بحر متدارک، بحر ہزج، بحر رمل، بحر کامل، بحر وافر، بحر منسرح، بحر مضارع، بحر سریع، بحر مجتث، بحر مقتضب، بحر طویل، بحر مدید، بحر بسیط، بحر قریب اور بحر مشاکل کو تفصیل کے ساتھ مع امثال و نقشہ جات بڑے ہی فطری انداز میں بیان کیا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب کے وقت عروض تک رسائی کے لیے اکرام تھچوری صاحب نے ڈاکٹر فرمان تھچوری، ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، پروفیسر عنوان چشتی مرحوم، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، ڈاکٹر محمد اسمٰعیل اور ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے گراں قدر مشوروں اور ان کی کتب کو پیش نظر رکھا ہے جس سے موضوع کے حسن میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ یقیناً تفہیم عروض کے لیے یہ بہترین کتاب ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس کی قیمت شائقین عروض کی استطاعت کے مطابق رکھی جاتی۔ جانے کیوں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی سے مالی امداد ملنے کے باوجود اس سے صرف نظر کیا گیا ہے۔

☆☆☆

نام کتاب : فکر و نظر
مصنف : پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
ضخامت : ۱۲۲ صفحات
قیمت : ۱۶۰ روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ ترسیل B/21 بندوق والا بلڈنگ، جبل روڈ (سائوتھ) ممبئی-۹
تبصرہ نگار : محمد ابوذر

زیر تبصرہ کتاب 'فکر و نظر' پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر کے پانچ سے زائد دہوں کی تدریسی زندگی کے دوران لکھے گئے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل و جرائد اور علمی و ادبی انجمنوں کی دعوت پر تحریر کیے گئے۔ پیش نظر مجموعے میں بارہ مختلف موضوعات پر مضامین شامل ہیں، جن میں سر سید، شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور مرزا غالب جیسی عظیم، مجتہد العصر اور نابغۂ روزگار شخصیتوں پر فکر انگیز اور عمدہ مضامین ہیں۔

گوریکر صاحب کا پہلا مضمون 'سر سید اور علی گڑھ تحریک' ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، پھر بھی مصنف نے اپنے منفرد اسلوب میں جو کچھ لکھا ہے وہ لائق دید ہیں۔ سر سید ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ سر سید اور علی گڑھ تحریک نے جدید تعلیم، سائنس، عقل پرستی اور اصلاح رسوم کے لیے راہیں ہموار کیں اور وہ سوالات اٹھائے جن کے جواب پر آئندہ کی علمی و ادبی ترقی کا انحصار تھا۔ مصنف نے اس مضمون میں انھی حقائق کی اہمیت و افادیت کا جائزہ لیا ہے۔ اس لحاظ سے کتاب کا پہلا مضمون خاصا اہم ہے۔

'ابوالکلام آزاد کے تعلیمی افکار' ایک جامع مقالہ ہے۔ اس مقالے میں تعلیم سے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی مستحسن کوشش ہے۔ ایک مضمون 'آغا حشر کی ایک نایاب نظم' ہے۔ اس میں گوریکر صاحب نے اردو ادب کے کرسٹوفر مارلو اور ہندوستانی ڈرامے کے ولیم شیکسپیر تسلیم کیے جانے والے آغا حشر کاشمیری کی نظم نگاری کا اجمالی جائزہ لیا ہے اور ان کے فکر و فن پر عمیق نگاہ ڈالی ہے جس سے کئی نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

فی الوقت گوریکر صاحب کے سبھی مضامین کے سلسلے میں اظہار خیال کی گنجائش نہیں ہے لیکن کتاب کے دیگر مشمولات میں 'شبلی نعمانی کی خدمات کا جائزہ'، 'محمد علی جوہر اور جامعہ ملیہ'، 'مرزا غالب ایک ذولسانی شاعر'، 'خواجہ گیسو دراز کی تعلیمات'، 'پروفیسر فیضی کی علمی شخصیت'، 'ڈاکٹر ٹیگور کی وشو بھارتی یونیورسٹی'، 'افسر سوری ایک گمنام شاعر'، 'معین الدین حارث کی ادبی شخصیت' اور 'شیواجی کی غیر فرقہ وارانہ حکمت عملی' قابل مطالعہ ہیں۔ ان مضامین میں قدرے تفصیلی انداز میں تحقیقی و تنقیدی اور تاثراتی جائزہ لیا گیا ہے۔ مزید برآں کتاب کا ایک مضمون 'اردو گرامر پرتگالی زبان میں' تحقیقی نوعیت کا ہے جو اردو کی ایک اولین قواعد 'گرامیکا اندوستانا' کا تعارف ہے اس لیے یہ الگ اہمیت کا حامل ہے۔ اس مجموعے کے دیگر مشمولات میں بھی دل چسپی کے عناصر موجود ہیں۔

گوریکر صاحب کے سبھی مضامین ان کی عالمانہ بصیرت کے حامل ہیں اس لیے کتاب کے سبھی مشمولات لائق مطالعہ ہیں۔

☆☆☆

بقیہ صفحہ ۸ سے آگے

جناب وسیم الحق نے کہا کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد بہت سی خوبیوں کے مالک تھے لیکن ان کی سب سے اہم خوبی یہ تھی کہ وہ منکسر المزاج اور بے لوث و بے غرض انسان تھے۔

جناب پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ۱۰ رفروری ۱۹۴۳ء کو ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس وقت سے ہمارے درمیان برادرانہ اور دوستانہ تعلق رہا۔ وہ انتہائی سیکولر نظریے کے حامل انسان تھے۔ اقبال ان کے سب سے محبوب شاعر تھے۔ اقبالیات کے متعلق ان کے بیش بہا تحقیقی کاموں کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ زندگی بھر بہت فعال اور متحرک رہے۔

جناب منصور آغا نے کہا کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد ایک سچے محب وطن تھے۔ وہ صرف گفتار کے ہی نہیں بلکہ کردار و عمل کے بھی غازی تھے۔ وہ نہایت محسن اور مہذب انسان تھے اور گنگا جمنی تہذیب کے نمائندے تھے۔

جناب سید حامد نے اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے علمی اور ادبی کاموں کو سراہتے ہوئے کہا کہ انھوں نے بہت زیادہ لکھا خاص طور سے اقبال پر ان کے کاموں کی بہت لمبی فہرست ہے۔ ان کا حافظہ بہت مضبوط تھا اور ان کی آواز میں سوز و گداز تھا۔ حامد صاحب نے کہا کہ میں نے اتنے شریف النفس انسان کم دیکھے ہیں۔ میں ہمیشہ ان کی انسانیت اور عظمت کا قائل رہا ہوں۔ انھوں نے پوری زندگی انسانیت، قومی یک جہتی اور سیکولر اقدار کو فروغ دینے کے لیے کام کیا۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی شخصیت بہت صاف اور شفاف تھی ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا اور وہ سیکولر روایات و اقدار کے حامی تھے۔ میں ان کو دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

جلسے میں درج ذیل تعزیتی قرارداد منظور کی گئی:

قرارداد تعزیت

جگن ناتھ آزاد صاحب اردو کے مشہور و معروف شاعر، ادیب اور نقاد تھے۔ ادب میں اُن کی سب سے زیادہ اہمیت یہ ہے کہ وہ اقبالیات کے ماہر جانے جاتے تھے۔ ہندوستان میں علامہ اقبال پر جتنا کام اقبال کے فن، نظریات اور شخصیت پر آزاد صاحب نے کیا ہے اتنا کسی اور ہندوستانی نے نہیں کیا ہے۔ ان کی تصنیفات کی مجموعی تعداد ستر سے زیادہ ہے۔ خود ان پر دس بارہ کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان و پاکستان کی آٹھ دس یونیورسٹیوں میں اُن پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے ہیں۔ ہندو بیرون ہند انھوں نے اپنی اقبال شناسی اور اردو نوازی کی بدولت بڑی عزت و شہرت پائی۔ بحیثیت استاد بھی انھوں نے اپنے شاگردوں میں بلند مقام حاصل کیا۔ وہ نہایت ہی ملنسار، متواضع اور بلند ہمت شخصیت کے مالک تھے۔ آزاد صاحب مرحوم صحیح معنوں میں ہندوستان کی گنگا جمنی اردو تہذیب کے نمائندے تھے۔ ان کی وفات سے آج ساری اردو دنیا سوگوار ہے۔

یہ جلسہ مرحوم پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور اُن کے تمام اعزا و متعلقین کو تعزیت پیش کرتا ہے۔

(رپورٹ: محمد عارف خاں)

بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

سنسکرت یونیورسٹی کالڈی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر صفیہ بی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ پروفیسر حسن نے اردو زبان میں استعمال ہونے والے ملیالم الفاظ پر ایک مقالہ پیش کیا۔ آخر میں شام غزل پروگرام منعقد کیا گیا جس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ سیمینار کا اختتام جناب پی۔ کے۔ اسماعیل (لکچرر شعبۂ اردو برنن کالج) کے شکریے پر ہوا اور آخر میں قومی ترانہ گایا گیا۔

(پریس ریلیز شعبۂ اردو گورنمنٹ برنن کالج تلیچری)

بقیہ صفحہ ۲ سے آگے

بیجاپور، خاندیس، برار اور احمد نگر تھیں۔ ان پر قبضہ کرنے کی ابتدا اکبر نے کی، جہانگیر اور شاہجہاں ان سے تعلقات استوار رکھنا چاہتے تھے، مگر ان کی شرارتوں سے تنگ آکر بالآخر ان پر فوج کشی کی اور ان کو زیر کرکے سلطنت تیموری میں داخل کیا، صرف دو ریاستیں حیدرآباد اور بیجاپور عالم گیر کے دور حکومت میں سلطنت مغلیہ کا حصہ بنیں۔ علامہ شبلی نے موضوع کے پیش نظر اختصار سے کام لیا ہے ورنہ وہ اس سوال کا جواب بھی دیتے کہ عالم گیر پر جو الزام لگایا جاتا ہے وہی الزام اکبر اعظم پر بھی لگایا جاسکتا ہے، مگر انگریز مورخوں نے عالم گیر کی شخصیت ہی کو کیوں نشانہ بنایا۔

(باقی آئندہ)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد ایک سچے محبِّ اردو، ماہر اقبالیات اور قومی یکجہتی کے علمبردار تھے

—— اندر کمار گجرال

نئی دہلی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد مختلف الجہات شخصیت کے حامل تھے۔ وہ ایک سچے محبّ اردو، ممتاز ماہر اقبالیات اور قومی یک جہتی کے علمبردار تھے۔ ان خیالات کا اظہار انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام پروفیسر جگن ناتھ آزاد مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ۲ راگست ۲۰۰۳ء کو منعقد تعزیتی جلسے میں سابق وزیر اعظم جناب اندر کمار گجرال نے کیا۔ جلسے کی صدارت جامعہ ہمدرد کے چانسلر جناب ترقی اردو (ہند) کا نام پوری دنیا میں عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے گجرال صاحب نے کہا کہ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ باپ بیٹے دونوں عظیم شاعر ہوں، اس معاملے میں پروفیسر آزاد خوش قسمت تھے کہ ان کے والد محترم تلوک چند محروم بھی اردو کے عظیم شاعر تھے۔ میں انھیں دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی تعارفی تھے۔ وہ شاعر تھے، ادیب، نقاد اور ماہر اقبالیات تھے۔ لیکن ان کی شخصیت کا ایک پہلو تھا اور وہ تھا انسانیت۔ ان کی شخصیت کو کسی بھی پہلو سے دیکھیے وہ انسان اور صرف انسان نظر آتے ہیں۔

جناب ایس. ایم. ظفر نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ حقیقت میں اردو کے سچے ہمدرد تھے یہی وجہ ہے کہ ہر اردو والے کے وہ کام آتے اور اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازتے اردو تحریک بلکہ ہر اردو والے کا ذاتی نقصان ہے۔ ہمیں اس کا فخر ہے کہ ہم نے انھیں دیکھا اور سنا ہے۔

ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی وفات سے اردو دنیا ایک نہایت معتبر شاعر، محقق اور اردو کے سچے سرپرست سے محروم ہوگئی۔ ان کے انتقال سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا لیکن وہ اپنی شاعری، اقبال پر اپنے تحقیقی کام اور متعدد تصانیف کے وسیلے سے ہمارے بیچ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

بے لوث اور پُرخلوص دوست تھے اور انتہائی صاف شفاف ذہن کے مالک تھے۔ اب اُن جیسے صاف، غیر جانبدار اور سیکولر انسان بہت کم ملیں گے۔

جناب جی. ڈی. چندن نے کہا کہ میں نے اور آزاد صاحب نے تقریباً دس سال تک ایک ساتھ کام کیا، وہ زندگی کی اچھی قدروں پر یقین رکھتے تھے۔ اقبالؔ کے عاشق تھے اور اردو کی خدمت کا اُن میں زبردست جذبہ تھا۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی



اسٹیج کا ایک منظر

تصویر میں (دائیں سے بائیں) ڈاکٹر سید فاروق، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، جناب سید حامد، جناب اندر کمار گجرال (سابق وزیر اعظم ہند)، ڈاکٹر خلیق انجم، جناب سید عاشور کاظمی (برطانیہ) اور جناب گلزار دہلوی۔

—— فوٹو: جاوید رحمانی

سید حامد نے فرمائی۔ اندر کمار گجرال نے مزید کہا کہ پروفیسر آزاد سے میرے تعلقات بہت عرصے سے تھے۔ وہ ایک کامیاب منتظم بھی تھے، انھیں جو کام بھی سونپا گیا اُسے بحسن وخوبی انجام دیا۔ اُنھی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج انجمن تقریر میں کہا کہ جس ہال میں آج پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی وفات پر تعزیتی جلسہ ہو رہا ہے اسی ہال میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد مرحوم نے ادبی، علمی اور لسانی موضوعات پر بے شمار تقریریں کی ہیں۔ آزاد صاحب کے فن کے بہت سے پہلو تھے۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی نے اس موقع پر اپنے مقالے کی تلخیص پیش کی جس میں انھوں نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں خاص طور سے ان کی انسان دوستی اور اقبالیات سے متعلق ان کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالی۔

محترمہ عائشہ نے اور جناب متین امروہوی نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

جناب فاروق ارگلی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ آزاد صاحب کی وفات اردو کا بہت بڑا سانحہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد صاحب کا اس طرح چلا جانا انجمن ترقی اردو اور برطانیہ سے آئے ہوئے مہمان جناب سید عاشور کاظمی نے کہا کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد انتہائی سیکولر، دیانت دار اور انسان دوست شخص تھے۔ ان کا مذہب انسانیت تھا اور وہ انسان دوستی میں سرحدوں سے بے نیاز تھے۔ وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

جناب کمال احمد صدیقی نے کہا کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی شخصیت کی بہت سی خوبیاں اور امتیازات ہیں۔ وہ نے کہا کہ آزاد صاحب کی وفات ہماری ادبی زندگی کا بہت بڑا حادثہ ہے۔ اقبالؔ کے تعلق سے وہ پوری دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے تھے اور اپنی رواداری کی بنا پر ہندوستان اور پاکستان میں وہ یکساں مقبول تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پروفیسر آزاد ایک اعلا درجے کے محقق اور شاعر ہونے کے علاوہ ہماری سیکولر روایات اور گنگا جمنی تہذیب کے بے مثل نمونہ تھے۔

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اڈیٹر: خلیق انجم

پرنٹر، پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، نئی دہلی۔۲

مالک: انجمن ترقی اردو (ہند) ۲۱۲۔ اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

قیمت (فی شمارہ) دو روپے — سالانہ: ۵۰ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)

Phones: 23237210, 23236299 Fax: 011-23239547

E-mail: urduadabndli@bol.net.in